حقیقت دین

حقیقت واقسامِ شرک

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ..... امّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ط اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ..... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

''حقیقت واقسامِ شرک'' کے موضوع پر مفصل گفتگو کا یہ سلسلہ اغلباً چھ نشستوں پر مشتمل ہوگا۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کے ذریعے سے اُمت مسلمہ میں حقیقتِ شرک کے بارے میں صحیح فہم وشعور پیدا فرمائے اور اس ضمن میں ہم سے کوئی مفید خدمت قبول فرمالے!

چند تمہیدی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس موضوع سے متعلق کچھ تمہیدی باتیں گوش گزار کرنی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے دین کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی جائے' یا بالفاظِ دیگر اس کی تعلیم کے لبِّ لباب اور خلاصے کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ لفظ ''توحید'' ہے۔ ہمارا دین دراصل ''دینِ توحید'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے توحید کو ہی وہ اصل امانت قرار دیا ہے جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہے:

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا!

اور جوابِ شکوہ میں بھی نبی اکرم ﷺ کے مشن کو علامہ اقبال نے اسی ایک لفظ ''توحید'' سے تعبیر کیا ہے:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

تو ہمارا دین اصل میں دینِ توحید ہے۔ ''توحید'' کی ضد ہے ''شرک''۔ شرک چاہے ثنویت کی شکل میں ہو' تثلیث کی شکل میں ہو یا کثرتِ اٰلِھَہ کی صورت میں ہو' اِن سب صورتوں کو ہم ایک ہی لفظ ''شرک'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب یہ بات طے ہے کہ ہمارا دین' دینِ توحید ہے تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس دین میں سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑا گناہ' جو ناقابلِ درگزر ہے' وہ شرک ہے۔ چنانچہ یہی بات سورۃ النساء میں دو مرتبہ بعینہٖ انہی الفاظ میں وارد ہوئی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ج﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''یقیناً اللہ تعالیٰ یہ بات تو ہرگز معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کمتر گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا''۔ اگرچہ اس آیت کو دوسرے گناہوں کے ضمن میں کوئی کھلا لائسنس نہیں سمجھ لینا چاہیے' اللہ تعالیٰ کا کوئی پختہ وعدہ اور یقین دہانی نہیں ہے کہ وہ دوسرے گناہ لازماً بخش دے گا' بلکہ الفاظ ہیں: ''لِمَنْ یَّشَآءُ'' کہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ لہٰذا یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ ہمیں کھلی چھٹی مل گئی ہے کہ ہم شرک کے سوا جس گناہ میں چاہیں ملوث ہو جائیں' کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ تاہم اُمید ضرور دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شرک کی معافی کی تو کوئی صورت نہیں ہے' البتہ اُس سے کمتر گناہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا معاف فرما دے گا۔

بہرحال معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں سب سے بڑا گناہ' سب سے بڑا جرم' جو ناقابلِ درگزر ہے' وہ شرک ہے۔ اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ ازروئے قرآن سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ بلکہ اچھی طرح جان لیجیے کہ قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ ''ظلم'' آتا ہے' اگر سیاق وسباق سے اس کے کوئی اور معنی متعین نہ ہو رہے ہوں تو وہاں اس کا معنی ''شرک'' ہے اور اسی اعتبار سے ''ظالمین'' کا معنی ''مشرکین'' ہے۔ چنانچہ آیت زیرِ گفتگو میں یہ حقیقت بیان ہوئی: ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ ''واقعہ یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

عربی زبان میں ظلم کا مطلب ہے: وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ ''کسی چیز کو اُس کے اصل مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھنا''۔ عدل اور انصاف یہ ہے کہ ہر چیز کو اُس کے اصل مقام پر رکھا جائے' جبکہ ظلم یہ ہے کہ کسی شے کو اس کے اصل مقام سے ہٹا کر کہیں اور رکھ دیا جائے۔ اب شرک میں بھی اِن دو میں سے ایک صورت ہوتی ہے کہ یا تو مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ

مَحَلِّہٖ" کی ایک صورت ہے۔اور یا پھر اللہ کو (نعوذ باللہ) گرا کر مخلوقات کی صف میں لایا جاتا ہے اور یہ "وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ" کی دوسری صورت ہے۔تو معلوم ہوا کہ "ظلم" کا سب سے بڑا مصداق "شرک" ہے۔

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے سورۃ الانعام کی آیت ۸۲ کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ سے "ظلم" کے بارے میں استفسار کیا تو آپؐ نے سورۂ لقمان کی زیر بحث آیت ۱۳ کا حوالہ دے کر فرمایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ "(حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا کہ اے مشرکو!) اگر تم جانتے ہو تو ذرا بتاؤ کہ دونوں گروہوں (موحدین اور مشرکین) میں سے کون امن وسکون اور اطمینان کا زیادہ حق دار ہے؟" ایک گروہ مشرکین کا تھا اور ایک موحدین کا۔ایک طرف صرف ایک اللہ کے ماننے والے تھے اور دوسری طرف وہ تھے جو اللہ کے ساتھ دوسرے بہت سے معبودوں کو ماننے والے تھے۔لہٰذا پوچھا گیا کہ ان میں سے حقیقی ذہنی سکون اور حقیقی قلبی اطمینان کا زیادہ مستحق کون ہے؟ یہ سوال کرنے کے بعد قرآن مجید اپنے ایک عام اسلوب کے مطابق خود جواب دیتا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

"جو لوگ ایمان لائیں اور اپنے ایمان کو کسی ظلم سے ملوث نہ کریں' حقیقت میں امن وسکون (اور اطمینان) کے مستحق وہی ہیں اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔"

یعنی جو اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہونے دیں۔اس پر صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین میں تشویش پیدا ہوئی کہ اگر اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے مشروط ہیں کہ ایمان کے ساتھ ظلم کی قطعاً آمیزش نہ ہو' تو ایسا کون شخص ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں دوسروں پر یا اپنے اوپر ظلم نہ کرتا ہو۔غور کیجیے کہ اگر آپ نے ایک لحہ بھی ضائع کیا تو یہ بھی اپنے اوپر ظلم ہے۔تو ظلم سے بالکل بری اور بالکل پاک ہو جانا کسی فردِ بشر کے لیے ممکن نہیں ہے۔چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنی اس تشویش کو ظاہر کیا کہ حضورؐ! ایسا شخص کون ہوگا جو ظلم سے بالکل بری ہو۔اس پر نبی اکرم ﷺ نے تسلی دی کہ اس آیۂ مبارکہ میں ظلم سے مراد شرک ہے۔اور آپؐ نے سورۂ لقمان کی اسی آیت کا حوالہ دیا کہ کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

تو مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ ایمان لائیں اِس شان کے ساتھ کہ شرک کی کوئی آمیزش نہ رہے تو وہ ہیں کہ جو امن کے مستحق ہوں گے اور وہی ہیں کہ جو ہدایت پر ہیں اور اپنی آخری منزلِ مراد تک پہنچ سکیں گے۔

اب میں اسی کا عکس (converse) آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔جب ہمارا دین' دینِ توحید ہے تو اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہوا کہ سب سے بڑا اور ناقابل معافی جرم اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کا ذکر آتا ہے۔آپؑ کی جلالتِ قدر اور مقام ومرتبہ کا یہ عالم ہے کہ آپؑ کی تین تین نسبتیں ہیں اور تینوں ہی نہایت بلند ہیں۔ایک نسبت اللہ کے ساتھ یہ ہے کہ آپ "خلیل اللہ" ہیں۔اس خُلّتِ الٰہی کا جو مقام ومرتبہ ہے اس کی عظمت کا کچھ اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میرا خلیل صرف اللہ ہے۔یعنی کوئی فردِ نوعِ بشر حتیٰ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی خُلّتِ محمدیؐ کے مقام پر فائز نہیں ہیں۔ارشادِ نبویؐ ہے: ((لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلًا)) (۱) "اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا"۔محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ خُلّت کا رشتہ صرف اپنے ربّ کے ساتھ تھا۔اور یہی وہ رشتہ ہے حضرت ابراہیمؑ کا اپنے ربّ کے ساتھ جس کی قرآن اہتمام کے ساتھ وضاحت کر رہا ہے: ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰھِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ (النساء) "اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خلیل بنالیا"۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلاۃ' باب الخوخۃ والممر فی المسجد۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب من فضائل ابی بکر الصدیقؓ۔

حضرت ابراہیمؑ کی دوسری نسبت رسولوں اور نبیوں کے ساتھ ہے' اور وہ یہ کہ آپؑ "ابوالانبیاء" ہیں۔سینکڑوں جلیل القدر پیغمبر آپؑ کی نسل میں گزرے ہیں۔اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ میں سے تین یعنی حضرات موسیٰ' عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم الصلاۃ والسلام ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہیں۔ان میں سے عیسیٰؑ اگرچہ بن باپ کے پیدا ہوئے' لیکن ان کی والدہ مریم علیہا السلام تو حضرت ابراہیمؑ کی نسل ہی سے ہیں۔ان کے علاوہ سینکڑوں نبی آپؑ کی نسل میں سے ہیں۔تو آپؑ ابوالانبیاء ہیں۔

آپؑ کی تیسری نسبت پوری نوعِ انسانی کے ساتھ یہ ہے کہ آپؑ "امام الناس" ہیں۔ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۴) "اور (یاد کرو) جب ابراہیمؑ کو اُن کے ربّ نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن سب میں پورا اتر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"۔اس جلالتِ قدر کے ساتھ قرآن مجید میں جہاں

کہیں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر آیا ہے تو اُن کو جو آخری سند دی جاتی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (البقرۃ) ''اور آپ (ابراہیمؑ) مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

معلوم ہوا کہ شرک سے بالکل آزاد ہو جانا انسانیت کے لیے معراج ہے اور یہ بلند ترین مقام ہے جس تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فرما دے کہ میرا یہ بندہ مشرک نہیں ہے' میرا یہ بندہ شرک سے پاک ہے تو گویا کہ اُسے آخری سند مل گئی' آخری سرٹیفکیٹ اور آخری testimonial مل گیا۔

اب تک کی گفتگو سے یہ واضح ہو گیا کہ ایک طرف تو ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم' سب سے بڑا گناہ' سب سے بڑا ظلم' جو ناقابل عفو ہے وہ شرک ہے۔ اور دوسری طرف سب سے بڑی سند' سب سے بڑا سرٹیفکیٹ اور سب سے اونچا مقام یہ ہے کہ انسان شرک سے بالکل پاک ہو۔ اب ان دونوں چیزوں کو بیک وقت ذہن میں رکھتے ہوئے میں ایک نتیجہ نکال رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ واقعتاً ہر گمراہی' ضلالت اور کج روی' خواہ وہ نظریات کی ہو' عقائد کی ہو یا اعمال کی' اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں شرک سے ملتے ہیں۔ اور ہر خیر و خوبی' بھلائی' نیکی' صحتِ فکر' صحتِ عقیدہ' صحتِ عمل وغیرہ کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب توحید کی فروع (corollaries) اور لازمی نتائج ہیں۔ تو اس طرح سے یہ ایک ہمہ گیر تصور ہے۔ شرک کی اقسام اور اس کی فروع کو اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ یہ وہ شجرۂ خبیثہ ہے کہ ہر بدی' ہر گناہ' ہر جرم' اور ہر نظریہ یا خیال کی گمراہی لازماً اسی کی کسی نہ کسی شاخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کے برعکس ہر خیر' ہر نیکی اور ہر بھلائی' خواہ وہ خیال اور نظریے کی ہو یا عمل کی ہو' اس کا تعلق لازماً توحید ہی کے شجرۂ طیبہ سے ہے۔ اس ''شجرِ توحید'' کے لیے قرآن مجید میں تمثیل آئی ہے اور اس کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ﴾ (ابراہیم) ''اس کی جڑ مضبوط و مستحکم ہے اور اس کی شاخ آسمان تک پہنچی ہوئی ہے۔''

شرک کی ہمہ گیری کا ایک تصور قرآن مجید میں سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾

''اور انسانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کو مانتے ہیں' مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ''۔

یہ بات جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا انکار تو تاریخ انسانی میں آپ کو شاذ ہی کہیں ملے گا' کہیں کہیں اس قسم کے لوگ مل جاتے ہیں کہ جن کی مت بالکل ماری گئی ہو۔ آج کے دَور میں بظاہر ایسے محسوس ہوتا ہے کہ خدا کا انکار بہت عروج پر ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کو وہ بھی مانتے ہیں جنہیں منکرین خدا سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت انہوں نے مادے کو خدا کے مقام پر لے جا کر بٹھا دیا ہے' خدا کا انکار نہیں کیا ہے۔ ایک حقیقت کبریٰ کو ماننے پر سب مجبور ہیں' جبکہ سارا اختلاف خدا تعالیٰ کی صفات میں ہے۔ مثلاً یہ اختلاف کہ وہ الحی ہے یا مُردہ ہے۔ اگر مُردہ ہے تو اسے مادہ کہہ لیجیے اور الحی القیوم ہے' صاحب ارادہ ہے تو وہ اللہ ہے۔ چنانچہ فرق تو سارا صفات کا ہے۔ بہرحال یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ خدا کو خدا کے نام سے ماننے والے تاریخ انسانی میں ہمیشہ عظیم اکثریت میں رہے ہیں اور خدا کا صاف انکار کرنے والے شاذ رہے ہیں۔ خدا کو کچھ اور ناموں کے تحت ماننے والوں کی تعداد بھی شاید کچھ مل جائے' لیکن جو سب سے بڑی گمراہی ہمیشہ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک بڑے خدا کو ماننے کے ساتھ ساتھ کچھ اور چھوٹے خداؤں کو بھی مانا اور تسلیم کیا گیا' ایمان کے ساتھ کسی نوع کے شرک کی آمیزش کر لی گئی' اور یہ ہے اصل گمراہی جو ہمیں پوری تاریخ انسانی میں پھیلی ہوئی اور چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں اپنے حقیقی قلبی احساسات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اٹھا ہے' مجھے یقین ہے کہ وہ جان بوجھ کر کبھی شرک نہیں کرتا' بلکہ ایسا ناممکن ہے۔ اس کے تصورات میں اگر شرک آتا ہے تو غیر محسوس طریقے سے در آتا ہے' کسی مغالطے کے باعث آتا ہے' وہ اس کو شرک سمجھ کر شرک نہیں کرتا' اس میں جہالت اور ناسمجھی کارفرما ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ ہر دَور میں شرک کا یہ مرض ایک نئی صورت اختیار کر کے سامنے آتا ہے جس کو پہچاننے میں کوتاہی رہ جاتی ہے' اور جب تک اس کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے اس سے پوری طرح بچنا ممکن نہیں۔ بقول شاعر:

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

یعنی خواہ تم کسی بھی رنگ کا لبادہ اوڑھ کر آ جاؤ میں تمہیں تمہارے قد سے پہچان لوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بزعم خویش بڑا موحد ہو اور پچھلے ادوار میں شرک کی جتنی بھی صورتیں رائج رہی ہوں اور علماء نے جن جن کی نشاندہی کر دی ہو اُن سب سے وہ اپنے آپ کو بری اور پاک کر چکا ہو' بایں ہمہ اپنے دَور کے شرک کو نہ پہچان پایا ہو اور اس میں وہ ملوث ہو۔

اس پر گفتگو تو بعد میں ہو گی لیکن میں مثال کے طور پر علامہ اقبال کی نظم ''وطنیت'' پیش کر رہا ہوں:

اِس دَور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور

تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اب غور کیجیے کتنا پیارا مصرعہ ہے: ''تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور''۔ آج سے ساڑھے چار ہزار برس کا آزر پتھر کی مورتیاں تراشتا تھا اور آج کا آزر کچھ خیالی تصورات کے بُت بنائے ہوئے ہے۔ زمانے زمانے کی بات ہے۔ اُس وقت انسان شاید زمین سے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ فٹ چھلانگ لگا سکتا ہوگا' لیکن آج چاند تک پہنچا ہوا ہے۔ لہٰذا شرک نے بھی بڑی اونچی اڑان اڑی ہے اور بڑی مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ اب ضرورت اُس عقابی نگاہ کی ہے جو اپنے دَور کے شرک کو پہچان لے۔ اگر یہ بصیرت نہیں ہوگی تو ہو سکتا ہے' جیسا کہ میں نے عرض کیا' ایک شخص اپنے خیال میں پورے خلوص کے ساتھ شرک کی ہر قسم سے اعلانِ براءت کر چکا ہو اور عملاً اپنے آپ کو اس سے بری کر چکا ہو' لیکن اس کے باوجود وہ کسی نوع کے شرک میں مبتلا اور ملوث ہو۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک بڑا جامع اور ہمہ گیر تصور ہمارے سامنے ہو۔ اور نہ صرف یہ کہ ہم اپنے ذہن اور فہم میں تمام اقسامِ شرک کا احاطہ کر لیں' بلکہ ہمارے اندر وہ اجتہادی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ شرک جو بھی نیا لبادہ اوڑھے اور جو بھی نئی شکل اختیار کرے' اسے بھی ہم پہچان سکیں۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک اندرونی بصیرت کی۔ اس کے لیے وہ اصول تلاش کر لیے جائیں کہ جنہیں اگر مدِّنظر رکھا جائے تو شرک چاہے جس صورت اور شکل میں بھی آ رہا ہو' جو بھی نیا بھیس بدلے اور جو بھی نیا لبادہ اوڑھے اس میں انسان اس کو پہچان لے۔ لہٰذا اِس وقت جو بحث ہوگی وہ زیادہ تر اقسامِ شرک کے ذیل میں ہوگی۔

اقسامِ شرک کے سلسلے میں ہمارے ہاں علماء نے مختلف تقسیمیں کی ہیں۔ مثلاً ایک تقسیم یہ ہے کہ ایک شرکِ جلی ہے اور ایک شرکِ خفی ہے۔ یعنی ایک تو نمایاں اور کھلم کھلا شرک ہے۔ مثلاً ایک شخص بُت کو سجدہ کر رہا ہے' جبکہ ایک خفی شرک ہے کہ جس کا تجزیہ کر کے ہی پتا چلتا ہے کہ شرک ہو گیا' وہ بظاہر نظر نہیں آتا۔ اس کی مثال یہ فرمانِ نبویؐ ہے کہ

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۱) ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا۔''

(۱) مسند احمد' کتاب الشامیین۔

ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے' لیکن جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تو وہ اپنی نماز لمبی کر دیتا ہے' سجدہ طویل کر دیتا ہے' تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ شرک ہے۔ بظاہر تو وہ وہی نماز پڑھ رہا ہے' اس میں وہی قیام ہے' وہی رکوع ہے' وہی سجود ہے' اُس نے وہی سورۃ الفاتحہ پڑھی ہے' وہی ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' اور وہی ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' کہا ہے۔ اپنی طرف سے اُس نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے' سوائے اس کے کہ ذرا نماز کا دورانیہ بڑھ گیا ہے' اگر پہلے دس سیکنڈ کا سجدہ ہو رہا تھا تو اب پندرہ سیکنڈ کا ہو گیا' لیکن تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک سجدے کے دو معبود ہو گئے۔ دس سیکنڈ کا سجدہ تو اللہ کے لیے تھا' لیکن بقیہ پانچ سیکنڈ کا سجدہ اُس شخص کے لیے ہے جسے وہ دکھا رہا ہے' اور یہی شرک ہے۔ تو ایک ہے شرکِ جلی اور ایک ہے شرکِ خفی۔

ایک اور تقسیم اس اعتبار سے کی گئی ہے کہ ایک ہے عقیدے کا شرک اور ایک ہے عمل کا شرک۔ ایک شخص مختلف معبودوں کو مانتا ہے نام لے کر' جبکہ ایک شخص وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی معبود کو نام لے کر تو نہیں مان رہا' لیکن اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے عمل میں شرک ہے۔ مثلاً نفس پرستی ایک قسم کا شرک ہے۔ ایک طرف حکم ہے اللہ کا اور ایک طرف خواہش ہے اپنے نفس کی۔ ہم کتنے ہی مواقع پر اللہ کے حکم کو پسِ پشت ڈال کر اپنے نفس کی خواہش کو مقدم کرتے ہیں! اُس وقت ہمارا اصل معبود کون ہے؟ ہمارا نفس ہی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (الفرقان)

''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے غور کیا اُس شخص کے حال پر جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ تو کیا آپ ایسے شخص کی ذمہ داری لیں گے؟''

یہاں نوٹ کیجیے کہ لفظ ''اِلٰہ'' استعمال ہوا ہے' تاکہ کوئی مغالطہ نہ رہے۔ اور یہی ہمارے کلمۂ طیبہ کا لفظ ہے: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ تو معلوم ہوا کہ عمل میں شرک ہو رہا ہے' اگرچہ عقیدے میں شرک نہیں ہے۔ اُس شخص نے کبھی بھی اپنے نفس کو معبود مانا نہیں' بلکہ آپ اس سے یہ بات کریں گے تو وہ آپ کا سر پھوڑ دے گا' لیکن درحقیقت اس کے عمل میں شرک موجود ہے۔ اسی کے ذیل میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))(۱) ''ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ یہاں لفظ ''عبد'' لایا گیا ہے۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔

اسی سے ''عبادت'' بنا ہے جس کے لیے فرمایا گیا: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ.....﴾ (البقرۃ:۲۱) ''اے لوگو! عبادت کرو اپنے ربّ کی جس نے پیدا کیا تمہیں.....'' آپ کو معلوم ہے کہ روپے اور پیسے کی پوجا کس نوعیت سے ہوتی ہے۔ روپے کو کبھی کسی نے معبود نہیں مانا' لیکن اگر کوئی بالفعل اس کی بندگی کر رہا ہے تو اس کا نام خواہ عبدالرحمٰن ہو یا عبداللہ ہو' لیکن اصل میں وہ ''عبدالدّینار'' اور ''عبدالدّرہم'' ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ ہم میں سے کتنے ہوں گے جو اِن دونوں چیزوں یعنی نفس پرستی اور دولت پرستی کے اندر ملوث نہ ہوں! اگر کوئی ستر فیصد اللہ کے احکام مان رہا ہے تو تیس فیصد میں کوتاہی کر رہا ہے۔ اور آپ اس کوتاہی کو صرف ایک متقی قدر نہ سمجھئے کہ بس اللہ کی بندگی میں کمی اور کوتاہی ہے۔ نہیں! بلکہ وہاں مثبت طور پر آپ کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں۔ یہ نفس کی بندگی ہو رہی ہے' پیسے کی بندگی ہو رہی ہے' شہرت کی پوجا ہو رہی ہے' اقتدار کی پوجا ہو رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہماری زندگیوں میں یہ دونوں عبادتیں' دونوں پرستشیں' دونوں پوجائیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ یہ شرک نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے لوگوں پر یہ آیۂ مبارکہ صادق آتی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''تو کیا تم کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو کوئی یہ جرم کریں اُن کا بدلہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر دیا جائے اور آخرت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے؟ اور اللہ اُن حرکات سے غافل نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔''

اب یہاں ''اَشَدِّ الْعَذَابِ'' کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ طرزِ عمل شرک ہے' اور شرک وہ جرم ہے کہ جس کے بارے میں اللہ نے فرما دیا کہ اس کی بخشش کا کوئی سوال نہیں۔

اقسامِ شرک کے حوالے سے دو تقسیمیں تو وہ ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھیں' یعنی شرکِ جلی اور شرکِ خفی' یا شرکِ عقیدہ اور شرکِ عملی۔ امام ابن تیمیہؒ کا ان مباحث میں بڑا اونچا مقام ہے۔ میں اُن کی اصطلاحات بھی آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ ایک ہے شرک فی المعرفۃ' یعنی اللہ کی پہچان میں شرک' اور ایک ہے شرک فی الطلب۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾﴾ (الحج) ''مدد چاہنے والا بھی کمزور اور بودا ہے اور جس سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور اور بودا ہے''۔ ہر انسان کی زندگی کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مقصود اور مطلوب کو معین کر کے دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ اور توحید کا تقاضا یہ ہے کہ مقصود اور مطلوب کے درجے میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہ ہو۔ کلمۂ طیبہ ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کا اس اعتبار سے مفہوم ہے: لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ۔ اگر مقصود و مطلوب اور محبوب ہونے کے اعتبار سے کوئی اور اللہ کے برابر ہو گیا' تو یہی تو شرک ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

ہُوں سے تجھ کو اُمیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

امام ابن تیمیہؒ نے شرک کی بحث کو اِن دو اصطلاحات میں جمع کیا ہے۔ ایک ہے ''شرک فی المعرفۃ'' یعنی اللہ کی پہچان میں کوئی کمی ہو' اس کی ذات و صفات کے ضمن میں کسی کو لا کر اس کا سا جمی اور ہم پلہ بنا دیا گیا ہو۔ یہ معرفت خداوندی میں شرک ہے۔ اور جو شرک فی العمل ہے اس کو انہوں نے نام دیا ''شرک فی الطلب'' کا کہ اگر مقصود و مطلوب اور محبوبِ حقیقی ہونے کے اعتبار سے کوئی شے' کوئی شخص' کوئی ہستی' کوئی ادارہ اللہ کے ہم پلہ ہو جائے' دل کے سنگھاسن پر اگر وہ اللہ کے برابر آ کر بیٹھ جائے تو جان لیجیے کہ یہ شرک فی الطلب ہے۔

اقسامِ شرک کے حوالے سے ایک تیسری تقسیم بھی ہے جو میرے نزدیک زیادہ عام فہم (comprehensive) ہے اور میں ذیل میں اسی کے اعتبار سے بحث کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس تقسیم کے حوالے سے اقسامِ شرک کا ایک دفعہ احاطہ کر لیا جائے تو اِن شاء اللہ وہ باطنی بصیرت پیدا ہو جائے گی کہ اگر کبھی شرک کی کوئی اور صورت بھی پیدا ہوئی تو اِس بصیرت کی روشنی میں اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو گی۔ اس تقسیم کی رو سے شرک کی تین قسمیں ہیں: ایک ہے ''شرک فی الذات'' یعنی اللہ کی ہستی' اللہ کی ذات میں کسی اور کو اس کا سا جمی اور ہم پلہ بنا لینا۔ اس کے لیے عربی کا اصل لفظ ''کُفْو'' ہے۔ (ہم اردو بول چال میں عام طور پر ''ہم کفو'' کہہ دیتے ہیں' حالانکہ لفظ ''کفو'' میں ''ہم کفو'' کا پورا مفہوم موجود ہے جو فارسی ترکیب ہے۔) سورۃ الاخلاص میں دوٹوک الفاظ میں فرما دیا گیا: ﴿وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾﴾ ''اور کوئی اس کا کفو نہیں ہے''! ''کفو'' کا مطلب ہے برابر' ہم سر۔ شیخ الہندؒ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے: ''اور نہیں ہے اس کے جوڑ کا کوئی۔'' پہلے زمانے میں شادی بیاہ کے معاملے میں یہ لفظ بہت استعمال ہوتا تھا کہ شادی کفو میں ہونی چاہیے' یعنی برابری کا معاملہ ہونا چاہیے اور اس معاملے میں مختلف اعتبارات سے دیکھا جانا چاہیے' تاکہ اَنمل' بے جوڑ والی بات نہ ہو جائے اور عدم موافقت نہ ہو' بلکہ ماحول کچھ ایک جیسا ہی ہو جس میں لڑکا اور لڑکے پلے بڑھے ہوں'

تقریباً ایک ہی سطح کی زندگی انہوں نے بسر کی ہو' عادات میں کہیں بہت زیادہ فرق نہ ہو' مبادا نباہ میں رکاوٹ بن جائے۔ اور یہ معاملہ درحقیقت حکمت میں سے ہے۔ تو اس لفظ ''کفو'' کو ذہن میں لایئے کہ کسی کو اللہ کا کفو بنا دینا ''شرک فی الذّات'' ہے اور یہ بدترین' عریاں ترین اور گھناؤنا ترین شرک ہے' جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔

دوسری قسم کا شرک ہے ''شرک فی الصفات'' کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی کو اس کے برابر کر دینا' مدّ مقابل بنا دینا' ساجھی قرار دے دینا اور مثل بنا دینا۔ آپ علماء کرام کے خطبات میں یہ الفاظ سنتے ہوں گے: لَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ وَلَا مَثِيْلَ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ۔ یہ تمام الفاظ اسی اعتبار سے ہیں کہ شرک کے ہر شائبے کی نفی ہو جائے' ہر نوعیت کا انکار ہو جائے' کہ نہ کوئی اس کا کفو ہے' نہ کوئی اس کا مثل ہے' نہ کوئی اس کی مثال ہے' نہ کوئی اس کا ہم رتبہ ہے' نہ کوئی اس کا ہم پلہ ہے' نہ کوئی اس کا مدّ مقابل ہے' نہ کوئی اس کا ساجھی ہے۔ تو صفات میں کسی کو کسی بھی پہلو سے اللہ تعالیٰ کے برابر کر دینا شرک فی الصفات ہے۔ اور میں پیشگی طور پر یہ عرض کر دوں کہ یہ بڑا لطیف اور نازک سا معاملہ ہے اور اس میں ایک علمی مسئلہ involve ہے۔ اس میں چند ایسی لطیف باتیں ہیں کہ اگر وہ مدّ نظر نہ رہیں تو بڑی آسانی سے انسان کا قدم توحید کی شاہراہ سے ہٹ کر شرک کے کسی راستہ پر پڑ سکتا ہے۔ اس میں مغالطہ بے شعوری طور پر' بلکہ میں تو کہوں گا کہ خلوص کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نوع کے شرک کے بارے میں ع ''ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را'' والا معاملہ ہے۔ جیسے پل صراط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے' ایسا ہی معاملہ شرک فی الصفات کا ہے۔ اس کے چند اہم اور موٹے موٹے مسائل پر جب گفتگو ہو گی تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی اور آپ کو اِن شاء اللہ الجبرا کے فارمولوں کی طرح وہ بات ہاتھ میں آ جائے گی کہ جس کے بعد ایسے بہت سے عقدے جو ہمارے ہاں عقائد کے ضمن میں پڑے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے بڑی کھینچ تان' کشمکش اور رسہ کشی ہے' وہ تمام عقدے حل ہوتے چلے جائیں گے۔

تیسرا شرک ہے ''شرک فی الحقوق'' یعنی اللہ کے حقوق میں اس کے ساتھ شرک کرنا' کسی کو حقوق کے معاملے میں اس کا ساجھی بنانا یا اس کے برابر کرنا۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ کے حقوق اگر گنے جائیں تو بہت ہو جاتے ہیں' لیکن ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق ایک لفظ ایسا بھی ہے کہ جس میں اللہ کے تمام حقوق جمع ہو جاتے ہیں اور وہ لفظ ''عبادت'' ہے' جو تمام انبیاء و رُسل f کی دعوت کا مرکزی نقطہ رہا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! عبادت کرو اپنے ربّ کی جس نے پیدا کیا تم کو اور اُن کو جو تم سے پہلے گزرے ہیں' تاکہ تم بچ سکو''۔ اور: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ﴾ (ھود: ۵۰'۶۱'۸۴) ''اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو' اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔'' اور: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۳﴾﴾ (نوح) ''یہ کہ اللہ کی عبادت کرو' اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری پیروی کرو۔''

عبادت انسان کی غایتِ تخلیق ہے' اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت (بندگی) کے لیے پیدا کیا۔'' لہٰذا اس لفظ ''عبادت'' میں اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق آ گئے۔ چنانچہ ''شرک فی الحقوق'' کو ''شرک فی العبادت'' کہا جا سکتا ہے۔ عبادت کے پانچ رُخ ہیں جن کے بارے میں بحث سے معلوم ہو جائے گا کہ شرک فی العبادت کی کون کون سی صورتیں ہیں۔ اس سے ہمیں اِن شاء اللہ موجودہ شرک کے علاوہ وہ قدیم شرک جو دنیا میں پائے گئے' ان سب کا فہم و شعور حاصل ہو جائے گا' بلکہ وہ بصیرت بھی پیدا ہو جائے گی کہ جس کے نتیجے میں آئندہ بھی اگر یہ مرض کسی اور صورت میں ظاہر ہوا تو اس کو سمجھنا اور پہچاننا آسان ہو جائے گا۔

شرک فی الذّات

اب میں اللہ کا نام لے کر ''شرک فی الذات'' کی بحث شروع کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ بدترین' عریاں ترین' گھناؤنا ترین اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شرک ہے۔ دنیا میں اس شرک کی دو صورتیں رائج رہی ہیں۔ ایک کو مذہبی نوعیت کا شرک کہا جا سکتا ہے اور ایک کو فلسفیانہ نوعیت کا شرک۔ بلکہ صحیح تر تعبیر یہ ہو گی کہ پہلا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا جو اپنے آپ کو رسولوں سے منسوب کرتی ہیں اور آسمانی ہدایت پر یقین رکھتی ہیں۔ اور دوسرا شرک وہ ہے جو اُن قوموں میں پیدا ہوا کہ جن کے مذاہب کی اصل حقیقت فلسفیانہ ہے' کچھ حکماء اور فلاسفہ کے فکر اور سوچ پر اُن کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

اب پہلی نوعیت کے شرک کو لیجیے! یہ ہے کسی کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی قرار دینا۔ ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا بیٹی تو ہم جنس اور ہم نوع ہوئے! جیسے مغل کا بیٹا مغل ہے' انسان کا بیٹا انسان ہے اور گھوڑے کا بیٹا گھوڑا وغیرہ۔ معلوم ہوا کہ یہ نوع میں' جنس میں' مرتبہ میں' غرض ہر اعتبار سے بالکل برابری اور کفو والا معاملہ ہے' اور یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ اور یہ کس قدر قابل تعجب بات اور ستم ظریفی ہے کہ اس نوع کے شرک میں مبتلا وہ لوگ ہوئے جو نبیوں اور رسولوں کے ماننے والے ہیں' جو جلیل القدر پیغمبروں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے

ہیں' آسمانی ہدایت کا دم بھرنے والے اور اللہ کی کتابوں کو ماننے والے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو مشرکینِ عرب تھے جو اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے اس موحد اعظم حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام کی طرف' اور اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم حنفی ہیں' یعنی دین حنیف پر ہیں' وہی دین حنیف جو کہ حضرت ابراہیمؑ کا دین تھا۔ اور ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

دوسری طرف یہودیوں نے حضرت عزیرؑ کو ''ابن اللہ'' کہا' انہیں اللہ کا بیٹا مانا گیا۔ تورات کو آپ پڑھ جایئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں شرک کی مذمت اس قدر شدت کے ساتھ آئی ہے کہ شرک کو زنا کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں بار بار آپ کو یہ تمثیل ملے گی کہ جیسے کسی شخص کی بیوی زنا کی مرتکب ہو اور اپنے شوہر سے بے وفائی کرے بالکل یہی طرزِ عمل ہے اُس شخص کا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہے اور شرک کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے بچھڑے کو اللہ کا شریک بنانے کی سزا کے طور پر ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا' اور یہی وہ ارتداد کی سزا ہے جو ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ وہاں شرک کی پاداش میں ہزاروں اسرائیلیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ لیکن اسی قوم میں پھر یہ شرک پیدا ہوا کہ انہوں نے حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا۔ اور یہ مرض اور گمراہی اپنی انتہا اور نقطۂ عروج کو پہنچی ہے عیسائیوں کے ہاں جنہوں نے حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ یہودیوں میں تو صرف ایک دَور ایسا گزرا اور اُن کے کچھ مخصوص فرقے تھے جنہوں نے یہ شرک کیا' مگر مسیحیت تو کُل کی کُل اسی عقیدے پر مبنی ہے' اور انہوں نے اس معاملے میں اس درجے غلو کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو صراحت کے ساتھ اللہ کا صلبی بیٹا قرار دیا اور ان کے لیے لفظ ''وَلَد'' استعمال کیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ ''اِبْن'' کے لفظ میں دو احتمالات ہیں۔ عربی زبان میں ''ابن'' کسی تعلق اور نسبت کو بھی ظاہر کرتا ہے' اور ضروری نہیں کہ وہ باپ اور بیٹے ہی کی نسبت ہو۔ مثلاً آپ کسی کو ''ابن الوقت'' کہتے ہیں تو وہ وقت کا بیٹا نہیں ہے' بلکہ اس کا بندھن اور تعلق وقت سے ہے' مرغِ بادنما ہے' ہوا اِدھر کی چل رہی ہو تو اِدھر کو اُس کا رُخ ہے' اُدھر کی چل پڑے تو اُدھر کو اس کا رُخ ہو جائے گا۔ اسی طرح ''ابن السبیل'' کہتے ہیں راستہ چلنے والے مسافر کو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ راستے کا بیٹا ہے' بلکہ راستے کے ساتھ جڑا ہوا ہے' چلا جا رہا ہے۔ تو ''ابن'' کا لفظ ذو معنیین ہے۔

اناجیلِ اربعہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ ''بیٹا'' کے معنوں میں اپنے لیے لفظ ''ابن'' استعمال کرتے تھے لیکن بطور استعارہ۔ جیسے تورات میں شرک کے لیے زنا کی تمثیل ملتی ہے کہ جیسے بیوی زنا کا ارتکاب کر کے اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی ہے' اسی طرح ایک شخص شرک کر کے اپنے ربّ سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسی طرح اس نسبت کو دیکھئے جو باپ اور بیٹے کے درمیان ہے کہ باپ بھی چونکہ اپنے بیٹے کو پالتا پوستا اور پروان چڑھاتا ہے' اس کی پرورش کرتا ہے' لہٰذا اسی نسبت سے حضرت مسیحؑ نے اللہ کو مخلوق کا ربّ ہونے کی حیثیت سے آسمانی باپ اور انسانوں کو اُس کے بیٹے قرار دیا۔ اناجیل اربعہ میں یہ بات ملتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اللہ تعالیٰ کو جہاں ''میرا آسمانی باپ'' کہتے ہیں وہاں ''تمہارا آسمانی باپ'' بھی کہتے ہیں۔ ایسا قطعاً نہیں ہے کہ انہوں نے خصوصیت کے ساتھ (exclusively) اپنے ہی لیے لفظ ''ابن'' استعمال کیا ہو' بلکہ ''تمام نوعِ انسانی کا آسمانی باپ'' کہا گیا اور صرف استعارہ کے طور پر۔ لیکن عیسائیوں نے آگے بڑھا کر اس عقیدے کو جہاں پہنچایا ہے وہ لفظ ''وَلَدٌ'' ہے۔ ''وَلَدٌ'' کے معنی صرف صلبی اولاد کے ہیں' اور اولاد میں بیٹے اور بیٹیاں دونوں شامل ہیں۔ لفظ ''وَلَدٌ'' میں کسی استعارے یا کسی اور تعلق کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ تو یہ جان لیجیے کہ قرآن مجید نے عیسائیوں کے بارے میں تو دونوں باتیں کہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو ''ابنُ اللّٰہ'' بھی قرار دیا اور ''وَلَدُ اللّٰہ'' بھی قرار دیا۔ جیسے اُن کا قول نقل ہوا: ﴿اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ (البقرۃ:۱۱۶ والکہف:۴)۔ لیکن قرآن نے یہودیوں کے بارے میں صرف ایک الزام لگایا کہ انہوں نے حضرت عزیرؑ کو ''ابنُ اللہ'' قرار دیا۔ اور مشرکین عرب کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

اب آپ دیکھئے' سورۃ الاخلاص' جو توحید کے موضوع پر جامع ترین سورۃ ہے' اس میں چار آیتوں میں سے پہلی دو آیتیں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اللّٰهُ الصَّمَدُ ۝﴾ تو فلسفیانہ ہیں اور بہت بلند مفہوم کی حامل ہیں۔ لیکن آخری دو آیات جہاں آ کر مضمون سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے' وہ اسی نوع کے شرک سے متعلق ہیں اور اس کی نفی کر رہی ہیں: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝﴾ ''نہ اُس نے جنا اور نہ وہ جنا گیا''۔ تمام صلبی رشتوں سے وہ بالکل پاک ہے۔ نہ کوئی اس کا باپ ہے نہ کوئی اس کی ماں ہے' نہ کوئی اس کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی بیٹی ہے۔ اور پھر اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا' جو نتیجہ نکالا گیا' وہ ہے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ ''اور اس کا کفو کوئی نہیں ہے''۔ اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے' اس کی برابری کا کوئی نہیں ہے' اس کا ہم پلہ کوئی نہیں ہے' اس کا ہم جنس کوئی نہیں ہے اور اس کی نوع کا کوئی نہیں ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت جو شرک کے موضوع پر بڑی جامع آیت ہے' جس میں شرک کی نفی کے چار اسلوب اختیار کیے گئے' اس میں سب سے پہلا اسلوب یہی ہے: ﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا.....﴾ ''اور (اے نبیؐ!) کہیے کہ تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا.....'' سورۂ بنی اسرائیل کے فوراً بعد سورۃ الکہف شروع ہوتی ہے۔ یہ دونوں سورتیں جڑواں ہیں اور حکمت قرآنی کے دو بہت بڑے خزانے ہیں جو قرآن مجید کے بالکل وسط میں موجود ہیں۔ سورۃ الکہف کے پہلے رکوع میں ذکر ہو رہا ہے:

﴿وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝﴾

''اور (اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ) وہ تنبیہ کر دیں اُن کو جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا۔ ان کے پاس اس ضمن میں کوئی علم نہیں ہے اور نہ ان کے آباء کے پاس۔ بہت بڑی بات ہے جو اُن کے مُنہ سے نکلتی ہے اور وہ محض جھوٹ بکتے ہیں''۔

اس نوع کے شرک پر اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا یہ انداز اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے اگلی سورۃ' سورۂ مریم کے آخری رکوع میں۔ جو شخص عبارت کے تیور کو پہچانتا اور لہجے کے فرق کو جانتا ہو وہ بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یہاں اللہ کا غیظ و غضب کس طرح بھڑکتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝﴾

''انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا بنا لیا ہے۔ تم ایک بڑی بھاری بات کر رہے ہو (بڑی جسارت اور بڑی ڈھٹائی کا معاملہ کر رہے ہو۔ یہ اس درجے کی جسارت اور ڈھٹائی ہے کہ) آسمان اس وجہ سے پھٹ پڑنے کو ہیں' زمین شق ہونے کو ہے اور پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ گر پڑنے کو ہیں' اس بات پر کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا قرار دیا' حالانکہ رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔''

ان میں سے آخری آیت بہت قابل غور ہے۔ شایانِ شان نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ یہ بڑی سادہ سی بات ہے' لیکن پیش پا افتادہ حقائق بسا اوقات نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اولاد کی ضرورت اصل میں اس لیے ہوتی ہے کہ کوئی ہستی خود فانی ہو۔ اگر کسی کو بقاء اور دوام حاصل ہو اور اسے دنیا میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہو تو اسے کسی اولاد کی ضرورت نہیں ہے۔ اولاد تو بقاءِ نوع اور بقاءِ نسل کے لیے ہے۔ جو فانی ہے وہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ میری اولاد کی شکل میں میری ہستی کا ایک تسلسل برقرار رہے گا۔ اسی لیے تو وہ روتے ہیں جن کے ہاں اولاد نہیں' خاص طور پر جن کی اولاد نرینہ نہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا نام مٹ جائے گا۔ یہی طعنہ تو دیا گیا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کو کہ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں' ان کا نام ختم ہو جائے گا' یہ تو ابتر ہیں' جس کے جواب میں سورۃ الکوثر نازل ہوئی:

﴿اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝﴾

جبکہ اللہ تعالیٰ تو خود دائم ہے' قائم ہے' باقی ہے' الحیّ القیوم ہے' لہٰذا ظاہر بات ہے کہ یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے بھی کسی اولاد کی احتیاج ہو۔ یہ ضرورت تو اصل میں ان کے لیے ہے جو فی نفسہٖ بذاتہٖ فانی ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝﴾ ''اور رحمٰن کے تو یہ شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے''۔ سورۃ الانعام کی بڑی پیاری آیت ہے:

﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ﴾ (آیت ۱۰۱)

''وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ کوئی اس کی شریک زندگی (بیوی) ہی نہیں ہے؟''

اس لیے کہ اللہ کے لیے بیٹا یا بیٹی مانو گے تو پہلے اس کے لیے کوئی بیوی بھی ماننا پڑے گی۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اللہ کے لیے کوئی بھی بیوی ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تو کیسے اس کے اولاد ہو جائے گی؟ وہ تو ''البدیع'' ہے۔ یہاں ''بدیع'' کے دونوں مفہوم ذہن میں رکھئے۔ ایک مفہوم ہے کائنات کو عدمِ محض سے وجود بخشنے والا۔ بدیع کا دوسرا مفہوم ہے انوکھی چیز' بے مثل چیز۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی وہ شان بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ بے مثل ہے' اپنی ذات میں بالکل انوکھا ہے' اس کی کوئی بیوی نہیں' تو اس کی اولاد کہاں سے ہو جائے گی؟

اس ضمن میں قرآن مجید نے مشرکین عرب کے ذکر میں کچھ لطیف طنز بھی کیے ہیں کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے تو بزعم خویش اللہ کو بیٹے دیے' لیکن تم نے تو کمال کیا کہ الاٹ بھی کیں تو بیٹیاں کیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) ''(یہ بڑی عجیب بات ہے کہ) تمہارے ربّ نے تمہیں تو بیٹے عطا کر دیے' اور خود اپنے لیے اس نے فرشتوں کو بیٹیاں بنا لیا؟ یقیناً تم بڑی بھاری بات اپنی زبان سے نکال رہے ہو۔'' سورۃ النجم میں فرمایا گیا: ﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝﴾ ''کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بڑی ہی غیر منصفانہ ہے۔'' اس لیے کہ تم نے اسے الاٹ بھی کی ہیں تو بیٹیاں کی ہیں۔ یہی بات سورۃ الصّٰفّٰت میں یوں فرمائی گئی: ﴿اَصْطَفَى الْبَنٰتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝﴾ ''کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں کو چھوڑ کر (اپنے لیے) بیٹیاں اختیار کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟''

(اس موضوع پر گفتگو اگلی نشست میں جاری رہے گی۔) اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○